

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علم والے ہی ڈرتے ہیں (قرآن)

مقام علم گھٹانے والے کے لئے تازیانہ عبرت

رسالہ مبارکہ

موازنہ علم و کرامت

از رشحاتِ قلم

علامہ پیر سید نصیر الدین نصیر گیلانی

سجادہ نشین آستانہ عالیہ خوشہ مہریہ گولڑہ شریف

موازنہ علم و کرامت

علم کی اہمیت و فضیلت سے انکار ممکن نہیں۔ فضیلت علم پر بے شمار عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں جو مختلف ادوار میں اہل علم و تحقیق حضرات نے بصورت تصنیف و تالیف ارباب فکر و نظر کے سامنے پیش کیے ہیں جن میں آیات قرآنیہ احادیث نبویہ، فرمودات اکابرین امت اور نگارشات دانشوران طائفہ انسانی کی روشنی میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جس کا اعادہ یہاں ضروری نہیں، البتہ ایک انسانی فطری، اور نفسیاتی پہلو سے ہم یہ بات قارئین کے ذہن نشین کرانا مناسب سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص جو بوجہ خود تعلیم حاصل نہ کر سکا ہو اپنی اولاد کو ضرور تعلیم دلواتا ہے یا کم از کم دلوانا چاہتا ہے۔ چاہے اُسے سکول بھیج کر دلوائے یا کسی مدرسہ میں۔ اُس کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ وہ علم کی اہمیت و فضیلت کو تسلیم کرتا ہے ورنہ اولاد کو تعلیم دلوانے کی کوشش کیوں کرتا؟ گویا ایک ان پڑھ اور جاہل انسان جو خود زیور تعلیم سے آراستہ نہیں وہ بھی درپردہ اپنی غفلت اور محرومی پر پشیمان ہے اس لئے اب وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی اولاد بھی جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وقت گزارے اور نور علم سے محرومی کی حالت میں زندگی کے سانس لے۔ علم کی فضیلت پر یہ ایک ناقابل تردید دلیل ہے جس کا ہم انسانی معاشرے میں آئے دن بخشم خود مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

لیکن بعض مقامات پر فضیلت علم کی نفی کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل ایسا کام دکھائے تو باعث حیرت نہیں اس لیے کہ وہ خود اس دولت سے محروم ہے، مگر جب ایک مدعی علم جو معاشرے میں صاحب علم بھی کہلاتا ہو، ایسی حرکت کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریمؐ نے جس چیز کو باعث فضیلت قرار دیا، آخر ایک علم والا خود اُس کی تذلیل و

تحقیق کے درپے کیوں ہے؟ اس موضوع پر مختلف اہل علم حضرات سے بات چیت ہوئی، متعدد صاحبان علم و فن کے سامنے یہ موضوع چلا، وجوہات پیش ہوئیں اسباب و علل سامنے آئے، آخر بڑی سوچ بچار اور اکابر اُمت کی کتب کے مطالعہ سے اس کی چند وجوہات سامنے آئیں اور ان وجوہات کا تعلق خالصتاً نفسیاتی دنیا سے ہے۔

یہ بات طے ہے کہ کوئی انسان اپنی تذلیل گوارہ نہیں کرتا، بلکہ اپنے لیے تعریف و توصیف ہی پسند کرتا ہے جب تک وہ کسی معاملے میں دوسرے پر غالب یا کم از کم برابر رہتا ہے تو اسی وصف کو باعث عزت سمجھتا ہے اور اس وصف یا فن کی خوبیاں بیان کرتا رہتا ہے، مگر جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس وصف یا فن میں کوئی اور مجھ پر غالب آ رہا ہے اور میں مغلوب ہو رہا ہوں یا اس وصف کے باعث معاشرے میں اس کی عزت بڑھ رہی ہے اور میری عزت و شہرت زوال پذیر ہو رہی ہے تو پھر وہ اسی علم یا فن کی لوگوں میں تنقیص شروع کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی کم علمی یا اس فن کی محرومی کے عیب کو چھپا سکے۔ اس طرح وہ شخص جو اس سے علم و فن میں فائق و غالب ہے، اس کے متعلق لوگوں کو یہ باور کراتا ہے کہ جس علم یا فن میں فلاں شخص مہارت رکھتا ہے اس میں کوئی خاص فضیلت کی بات نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اسے طفل تسلی بھی کہا جاسکتا ہے، گویا وہ یہ عمل کر کے اپنے اندر کے بچے کو تسلیاں دیتا ہے تاکہ اس کا طفل دل مزید پریشانی کا شکار نہ ہو اور اسے رات کو چین سے نیند آجایا کرے۔

امام غزالی نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف احیاء علوم الدین میں حسد و کینہ چہ جاہ اور کبر و ریا کے ابواب میں انسان کے اس نفسیاتی خلفشار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ گویا انسان صرف اپنی عزت و شہرت ہی برداشت کر سکتا ہے، اپنے کسی ہم پیش کی فوقیت اور شہرت و کمال کا برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ ایسے عظیم لوگ جو ایسی قبیح و ذلیل صفات سے مزین ہوتے ہیں ان کی تعداد ہر دور میں بہت ہی کم رہی ہے۔

اکابر محدثین، فقہاء، مفسرین، خطباء، شعراء اور دوسرے تمام علوم و فنون کے ماہرین تقریباً اسی صورت حال سے دوچار رہے اور ان کو اپنے دور میں ایسے حاسدین ناقصین سے سابقہ رہا

ہے۔ تاریخ کی اوراق گردانی سے بعض ایسے ایسے محیر العقول واقعات سامنے آتے ہیں کہ انسان درجہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

ہم سری اپنی کسی کو کب گوارا ہو سکی
دل ہی دل میں آدمی سے آدمی جلتا رہا

مولانا جلال الدین رومی اور مولانا عبدالرحمن جامی کی علمی، ادبی اور روحانی عظمتوں کا ایک زمانہ معترف ہے، مگر ان کے بعض معاصرین نے نہ صرف ان پر کڑی تنقید کی، بلکہ ان کو عمر بھر تسلیم نہیں کیا اور ان سے منسوب علوم و فنون کی توہین و تنقیص بھی کرتے رہے۔ حالانکہ علوم و فنون کا اس میں کیا قصور تھا؟ بلکہ ان محمود شخصیات کی ان علوم و فنون میں مہارت ہی کے سبب حاسدین نے ان علوم و فنون کی افادیت و اہمیت سے بھی انکار کر دیا۔ مولانا جلال الدین رومی کو شہر کے مفتیوں، خطیبوں اور برائے نام فقیہوں نے ہمیشہ نشانہ ملامت بنائے رکھا۔ عارف رومی کا قصور یہ تھا کہ جو کچھ وہ اپنی نگاہ میں اور مغز بیدار سے محسوس کرتے اور سمجھتے تھے، اُسے برملا لکھتے اور بیان کرتے تھے۔ یہی حال مولانا جامی کا تھا کہ انہیں ان کی روشن خیالی اور بیدار مغزی کی وجہ سے سب ملامت کا نشانہ بننا پڑا۔

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

ما را خراب کردی و خود مبتلا شدی

مگر تاریخ شاید ہے کہ نہ وہ مفتی فتوے داغنے سے باز آئے اور نہ رومی و جامی نے اپنا چلن بدلا۔ اگر یہ حضرات بھی ماحول کے ہر اچھے بُرے سے اتفاق کر لیتے اور سب کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو شاید معاصرین ان سے یہ سلوک نہ کرتے مگر چونکہ وہ ذہنی الطبع، سلیم الفطرت، ذہین، جہنیش اور نابغہ روزگار نفوس تھے اور معاصرین کی اکثریت ان کے علمی و فنی مقام سے بہت نیچے تھی اسی لیے انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے علمی و فنی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ معاصرین کی ہرزہ سرائیوں اور یادہ گوئیوں پر کان دھرنے کے بجائے ایسے ایسے علمی و ادبی شاہکار

چھوڑے کہ قیامت تک آنے والی نسلیں اُن کی علمی عظمتوں کو سلام کرتی رہیں گی۔ بقول حافظ شیرازی۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود

سال ہا سجدہ صاحبِ نظراں خواہد بود

مولانا رومیؒ کی مثنوی جس کو ہر دور میں اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ ذوق و عرفان نے اپنے لیے مُرشدِ راہ بنایا، کثیر تعداد میں شروحات لکھیں اور اس مقولہ کو سچ جانتے مانتے ہوئے کہ..... عہدِ بہت قرآن در زبانِ پہلوی..... صوفیائے کالین نے اس کا درس باقاعدگی سے دیا اور بطورِ وظائف اپنے مطالعہ میں رکھا مگر اس کے بھی بعض مندرجات اور تمثیلات پر معاصرین کے علاوہ آج تک مخالفین تصوف آئے دن ایک نہ ایک محاذ کھڑا کیے رکھتے ہیں اسی طرح کلیاتِ جامیؒ میں غزلیات اور بعض رباعیات و قطعات پر اعتراض کیے جاتے ہیں مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی حضرت رومیؒ و جامیؒ کی علمی و ادبی عظمتیں صرف اس لیے مجروح نہیں ہو سکیں کہ انہوں نے اپنے خداداد ذہن رسا کی اُن بلند یوں پر جا کر کلام کیا تھا، جہاں تک گند ذہن، کم عقل اور بے علم ناقدین و حاسدین پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بقول مرزا ابیدلؒ۔

سر بے نیازی فکر را بہ بلندئی نرساندہ ام

کہ بجز تنقیحِ نظم من اُحدے خیالِ زمیں کند

قرآن مجید جو شریعت کی اولین اصل، تمام علوم کا مأخذ اور حقائق کائنات کا مصدر و منبع ہے، جا بجا فضیلتِ علم پر شاہد و ناظر ہے۔ یہ امر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں حسنِ عمل یعنی اعمالِ صالحہ پر بھی زور دیا گیا اور ایمان کے ساتھ اکثر مقامات پر معطوف کر کے اعمالِ صالحہ کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا، مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ خود لفظِ ایمان مع تفصیل و معانی کے علم کا مقتضی ہے چلو علم بقدرِ ضرورت ہی آہی، لیکن بغیر علم کے تو مفہومِ ایمان کی بھی سمجھ نہیں آسکتی اور دوسری بات یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کے لیے بھی علم شرعی ضروری ہے، بلکہ علم کے بغیر عمل ممکن ہی نہیں اور اگر ہے تو بھی بے سود ہے۔ چنانچہ

درج ذیل آیات قرآنیہ اس بات کی تائید فرما رہی ہیں۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔

ترجمہ: فرمادیجئے کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔ قولہ تعالیٰ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعِلْمُونَ۔ ترجمہ: ان کو علم والوں کے بغیر کوئی نہیں سمجھتا۔ قولہ تعالیٰ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ سے علم والے ہی ڈرتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ۔ ترجمہ: بلند کر دے گا اللہ ان لوگوں کو کہ ایمان لائے ہیں تم میں سے اور ان لوگوں کو کہ دیئے گئے ہیں علم، کئی درجے۔ قولہ تعالیٰ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ۔ ترجمہ: گواہی دی اللہ تعالیٰ نے کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ اور گواہی دی فرشتوں نے اور اربابِ علم نے حال یہ کہ اللہ قائم ہے ساتھ انصاف کے۔ بطورِ نمونہ یہ چند آیات درج کی گئی ہیں ورنہ قرآن مجید میں بیسیوں آیات اس موضوع پر موجود ہیں۔

دوسرے اصلِ شرع یعنی سنت و حدیثِ نبویؐ میں بھی فضیلت و اہمیتِ علم پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ جل شانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے اِنِّیْ عَلِیْمٌ اُحِبُّ کُلَّ عَلِیْمٍ یعنی میں علم والا ہوں اور ہر صاحبِ علم کو دوست رکھتا ہوں۔ ارشادِ نبویؐ ہے فَضَّلَ الْعَالِمُ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضَلِیْ عَلٰی اَدْنٰکُمْ ترجمہ: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری تم میں سب سے ادنیٰ پر۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد میں دو مجلس، مجلسِ اہل ذکر و مجلسِ تعلیم و تعلم کے ملاحظہ فرمانے کے بعد ہر دو مجلس کے اہل پر خوشنودی ظاہر فرمائی اور سلسلہٴ تعلیم والے گروہ کو ذاکرین پر ترجیح دی اور فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا۔ میں بہ حیثیتِ منصبِ معلّمی مبعوث ہوا ہوں۔ اس طرح گروہِ اہل علم کو اپنے ساتھ شرفِ شمولیت بخشا اور اُن کے پاس جلوس فرمایا نیز متعدد اقوالِ صلحاء و ارشادات صحابہ عظام بھی اس موضوع پر موجود ہیں مگر باوجود ان تمام قطعی دلائل اور براہین و

نہج کے بعض جہلاء کا خیال ہے کہ کرامت کا مقام علم سے زیادہ ہوتا ہے اُن کو اتنا علم نہیں کہ دراصل علم ہی منبع کرامات ہے۔ علم خود ایک اتنی بڑی کرامت ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی دوسری کرامت کی ضرورت ہی نہیں رہتی، کیونکہ کرامت، تکریم اور اکرام کے معنی عزت و مرتبہ والا ہونا یا کسی کی عزت و احترام کرنا ہے اور مندرجہ بالا آیات و احادیث سے روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا ہے کہ عزت و کرامت عند اللہ و عند الرسل ﷺ علم والوں ہی کی ہے۔ ہم آگے چل کر کرامت کے معنی و مفہوم اور اس کی شرعی حیثیت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں لیکن گئے ہاتھوں یہ بھی ذہن نشین کرائے دیتے ہیں کہ قرآن مجید کی جس آیت مقدسہ کو اثبات کرامت کے لیے پیش کیا جاتا ہے وہ کرامت علم و اہل علم ہی ہے۔ و قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكُتُبِ كَسَفَتْ سَافَاً ظَاهِرٌ هُوَ كَيْفَ يَكُونُ لَكَ عِلْمٌ مِّنْ كِتَابِ اللَّهِ إِذْ هُوَ كَرِيمٌ۔ پہلے تخت بلقیس لانے کا دعویٰ کیا تھا اس کے پاس بھی کتاب کا کچھ علم تھا یعنی اُس کی اس کرامت کے صدور کا باعث بھی علم کتاب ہی تھا ورنہ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرما سکتا تھا کہ ایک شخص نے آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں تخت لے آنے کا دعویٰ کیا اور اس کے وصف علم کا ذکر نہ فرماتا۔ تب یہ کہا جاسکتا تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی موجودگی میں جس شخص نے تخت لانے کا کہا وہ صرف ایک مادر زاد ولی تھا، جیسا کہ آج کل کے بعض جاہل، علم کو ولایت کی شرط قرار نہ دیتے ہوئے ایک اُن پڑھ آدمی کو بھی مادر زاد ولی کہہ دیا کرتے ہیں، مگر یہ فلسفہ خانہ زاد اور سرسرا غلط ہے اور یہ لوگوں کو محض بے وقوف بنانے والی بات ہے کہ ایک بے علم آدمی کو لوگوں کی توجہ اور عقیدت کا مرکز بنانے کے لیے مادر زاد ولی کی خود ساختہ اصطلاح سے حُرمت لفظ مجروح کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس کا فیصلہ فرما دیا کہ سلیمان علیہ السلام کے سامنے جس شخص نے تخت لانے کے لیے اپنی خدمت پیش کی تھی وہ ایک عالم کتاب تھا کوئی اُن پڑھ محض مادر زاد ولی کہلوانے والا نہ تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کرامات کے صدور و ظہور کے لیے صاحب علم ہونا بھی ضروری ہے نیز یہ امر بھی اصحاب تحقیق پر مخفی نہیں کہ دربار سلیمان علیہ السلام میں تخت بلقیس لانے والے شخص کے متعلق مشہور قول ہے کہ وہ آپ کا وزیر آصف بن برخیا تھا یہ حتمی اور قطعی قول نہیں ہے، بلکہ کتب معتبرہ میں

دیگر اقوال بھی ہیں۔ چنانچہ شرح عقائد کی عبارت کاتیان صاحب سلیمان علیہ السلام و هو آصف بن برخیا علی الاشهر بعرض بلقیس قبل ارتداد الطرف مع بعد المسافة اس عبارت کے حاشیہ میں ہے۔ قوله و هو آصف بن برخیا الخ وزیر سلیمان وقیل کاتبہ وکان صدیقاً عالمّاً اسمہ اسطوم وانما قال علی الاشهر لانه قيل انه الخضر عليه السلام وقيل جبرئيل او ملك ايده الله تعالى به وقيل سليمان نفسه ۱۲ کتبی۔ نیز اس کے حاشیہ پر مولانا برخوردار ملتانی یہی تحریر کرتے ہیں۔

هو وزير سليمان وقيل كان صديقاً عالمّاً واسمہ اسطوم وانما قال علی الاشهر لانه قيل الخضر وقيل سليمان نفسه وکان آصف من بنی اسرائیل۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔ آصف بن برخیا وزیر او الخضر او جبریل و ملک ایده اللہ بہ او سليمان نفسه۔ فيكون التعبير عنه بذلك للدلالة على شرف العلم وان هذه الكرامة كانت بسببه الخ

تفسیر روح المعانی میں ہے۔ واختلف في تعيين هذا القائل فالجمهور ومنهم ابن عباس ويزيد بن رومان واحسن على انه آصف بن برخيا بن شمعيا۔ کان وزر سليمان على المشهور، وفي مجمع البيان أنه وزيره وابن أخته وکان صدیقاً يعلم الاسم الاعظم وقيل كان كاتبه و آخرج ابن ابی حاتم عن مجاهد أنه رجل اسمہ اسطوم وقيل اسطورس۔۔۔۔۔ وأخرج هو ايضاً عن ابن لهيعة أنه الخضر عليه السلام۔۔۔۔۔ وقال النخعي هو جبريل عليه السلام و قيل هو ملك آخر ايده الله تعالى به سليمان عليه السلام وقال الجبائي هو سليمان نفسه عليه السلام۔

تقریباً یہی اقوال تفسیر کبیر للامام فخر الدین رازیؒ میں بھی موجود ہیں۔

مفاد ان مذکورہ بالا عبارات کے نقل کرنے کا یہی ہے کہ مجلس سلیمانہ میں وہ حاضر شخص جو بھی تھا عالم کتاب تھا کیونکہ لفظ صدیقاً عالم صراحت کر رہا ہے تو ہمارا موقف واضح ہو گیا۔ صدور کرامت کسی صاحب علم سے ہی ہوتا ہے اور علامہ بیضاویؒ نے تو صراحت فرمادیا کہ یہ بات شرف علم کے اظہار کے لیے تھی اور امام غزالیؒ نے بھی اپنی کتاب حقیقۃ العلم کے پہلے باب میں یہی فرمایا کہ ”اس میں اس بات کی تنبیہ ہے کہ وہ علم کے زور پر تخت لانے پر قادر ہوا“ اگر کچھ دیر کے لیے ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ علم کے بغیر بھی کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ کرامت کے ظہور کے لیے مزوجہ اصلاحتہ تصوف کے مطابق غوث، قطب یا ابدال ہونا بھی ضروری ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس سے کرامت ظاہر ہوگی وہ ضرور غوث، قطب یا کم از کم ولی ہوگا۔ مگر مقام تعجب ہے کہ تصوف کے ایک بہت بڑے شیخ نے اس بات کا بھی فیصلہ کر دیا جن کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مادر زاد ولی تھے۔ مگر انہوں نے کسی بھی جگہ اپنی ولایت و قطبیت کا سبب محض بطنِ مادر سے اپنے ولی پیدا ہونے کو قرار نہیں دیا، بلکہ صاف الفاظ میں اپنی قطبیت کا واحد سبب حصول علم کو قرار دیتے ہوئے فرمایا..... ع

درست العلم حتی صرت قطباً

یعنی میں نے اتنا پڑھا کہ پڑھتے پڑھتے قطب وقت بن گیا اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس مصرع میں حضرت پیران پیرؒ نے صرف حصول علم پر زور دیا یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اتنا عمل کیا کہ عمل کرتے کرتے قطب وقت بن گیا، حالانکہ ان کی ساری زندگی علم و عمل کا حسین امتزاج رہی مگر یہاں صرف علم کی اہمیت کو اجاگر کرنا مقصود تھا۔

حضرت پیران پیرؒ سے عقیدت کا دعویٰ رکھنے اور ان کے نام پر کھانے اور عزت پانے والے یہ بتائیں کہ کیا علم کے بغیر کوئی شخص قطب یا مادر زاد ولی بن سکتا ہے؟ اگر پیران پیرؒ جیسا جگت شیخ عرصہ دراز تک علم حاصل کرتے کرتے کہیں جا کر قطب وقت بنتا ہے تو اس سے بڑھ کر ایسا کون نابغہ روزگار اور مافوق الفطرت انسان اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے یا کوئی کسی کے لیے یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص علم کے بغیر قطب وقت یا مادر زاد ولی تھا، یا ہے۔ یا تو پیران پیرؒ کے اس مندرجہ بالا مصرع

شعر کو قصیدہ غوثیہ سے یہ کہہ کر خارج کرنا پڑے گا کہ یہ الحاقی شعر ہے یا حضرت صاحب عالم سکر میں ایسا کہہ گئے یا پھر ان کی بیان کردہ اس حقیقت کو بہ طور عقیدہ تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ جب دوسرے بہت سے معاملات میں بزرگوں کے اقوال و اشعار کو عقیدے کے درجہ پر رکھا جاتا ہے تو ان کے بعض خلاف طبیعت اشعار و اقوال کو تسلیم کرنے میں تاثر سے کام کیوں لیا جاتا ہے کیا یہ دوہرا رویہ اور دورِ خاطر زعمی عقیدت کہلائے گا یا منافقت؟

قارئین گرامی کو بہ طور یاد دہانی بتانا چلوں کہ حضرت پیران پیرؒ کے ان تمام مناجاتی اشعار اور وظائف و اوراد میں موجود کلمات اور مواعظ و ارشادات میں مرقوم الفاظ کو یہ نام نہاد غلامانِ غوث پاک لائق توجہ اور قابل التفات ہی نہیں سمجھتے، جن میں خالص توحید کا درس دیا گیا ہے اور ہمہ قسمی ذاتی و صفاتی شرک کی زبردستی نفی کی گئی ہے یا جن سے پیران پیرؒ کا ذوق توحید پرستی آشکار ہوتا ہے اور ان کا ایک سچا اور پکا مومن موصوف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے اس قول کی تائید کے لیے آپ کی تصانیف فتح الزبانی، فتوح الغیب وغیرہ موجود ہیں اور بہجۃ الاسرار میں آپ کے فرامین و ارشادات بھی اس پر شاہد و ناظر ہیں۔

یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پیران پیرؒ مادر زاد ولی تھے تو انہوں نے حصول علم کی خاطر بختیر (ایران) سے بغداد تک کا طویل تر سفر کیوں اختیار فرمایا تھا۔ اگر وہ پیدائشی ولی ہوں تو معاذ اللہ ہمیں اس بات پر ذرہ بھر بھی اعتراض نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حصول علم کا مقصد قرب خداوندی ہوتا ہے اور قرب خداوندی کو ہی ولایت کہتے ہیں کیوں کہ ولی کا معنی دوست کے ہیں اور دوست وہی ہوتا ہے جسے قرب بھی حاصل ہو۔ عدم قرب عدم ولایت پر دال ہوتا ہے اور حصول قرب وجود ولایت (دوستی) پر دلالت کرتا ہے جب پیدائشی طور پر آپ کو وہ منزل (منزل ولایت) مل گئی تو پھر اس چیز کے تحصیل کی کیا ضرورت تھی یا یہی وہ اس چیز (علم) کو حاصل کرنے کی خاطر کیوں عمر بھر کوشاں رہے جس کے حصول کا منشا قرب خداوندی ہوتا ہے؟ اصطلاح صوفیاء میں قرب خداوندی ہی کو ولایت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو جب پیدائشی طور پر انہیں منزل ولایت یعنی قرب

خداوندی حاصل ہی تھا تو پھر تحصیل علم کے لیے مختلف صعوبتیں اور تکلیفیں اٹھانے کا کیا مقصد تھا؟ ایک حاصل شدہ چیز کو دوبارہ حاصل کرنا تحصیل حاصل نہیں تو اور کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت پیران پیرؒ کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں پیدائشی طور پر استعدادِ قرب اور جوہرِ کمال رکھا گیا تھا اور ان کا قلب اطہر ازل سے انوارِ ذات کا مرکز بننے کی صلاحیت لے کر بشری قالب میں ڈھلا تھا اگر یہ مفہوم لیا جائے تو بشمول حضرت پیران پیرؒ کے کئی دوسری شخصیات پر بھی ماورِ زادولی کے اطلاق کو درست مانا جاسکتا ہے، بصورتِ دیگر وہی اعتراضات وارد ہوں گے جن کا اوپر تذکرہ کر دیا گیا۔

اسی طرح آج کے کم علم لوگ یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ حضرت پیر مہر علی شاہؒ علم کی وجہ سے مرزا قادیانی کے مقابلے میں نہیں نکلے بلکہ کرامت کے زور پر سامنے آئے تھے۔ یہ فلسفہ بھی سراسر جہالت اور بے علمی پر مبنی ہے اور یہ بات کہنے والے لفظِ کرامت کا صحیح تلفظ بھی ادا نہیں کر پاتے بلکہ کاف کو مکسور پڑھتے ہوئے کرامت کہتے ہیں حالانکہ عربی اور فارسی کی متعدّد لغات میں یہ لفظ مفتوح الکاف یعنی کرامت ہی آتا ہے۔ اس مذکورہ بالا خود ساختہ فلسفہ کا جواب ملاحظہ ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علم بذاتِ خود ایک بہت بڑی کرامت ہے، کیونکہ لفظِ کرامت کے مفہوم و معنی بھی اختصاص، امتیاز اور فضیلت کے ہیں۔ میرے پاس اس پر منصوص دلیل حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا وہ ارشاد ہے جسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: اس آیت میں کہا گیا کہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور پھر ان ہر دو حضرات نے اس (ولقد آتینا داؤد و سلیمان علماً و قالوا الحمد لله الذي فضلنا على كثير من عباده المؤمنين) عطا کردہ علم کو اپنے لیے وجہِ فضیلت و کرامت فرمایا نہ کہ اپنے کسی معجزہ کو۔ حالانکہ انہی حضرات سے معجزات کا صدور بھی ہوا مگر انہوں نے قابلِ ذکر چیز اپنے کسی معجزہ کو نہ سمجھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علم کو اپنے لیے وجہِ کرامت و امتیاز گردانا۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ کسی بھی خرقی عادت کا کام کا صدور معجزہ کی صورت میں ہو یا کسی غیر نبی سے کرامت کی شکل میں ہو علم دونوں کے لیے قدرِ مشترک اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ آیتِ مؤلہ بالا میں فضلنا اور کرمنا کے معنی ایک ہی ہوئے یعنی تفضیل اور

تکرمیم کے الفاظ واحد المعنی ٹھہرے۔ لہذا میرا یہ کہنا کہ علم بذاتِ خود سب سے بڑی فضیلت اور کرامت ہے مؤلہ بالا آیتِ قرآنی کی رو سے بالکل صحیح ٹھہرا۔ نیز شرح عقائد کے حاشیے پر ہے:

اعلم انّ الكرامة اسم من التكريم والاكرام و جمعها الكرامات وهو الفعل خارق للعادة غير مقرون بالتحدي وقد اعترف بها اهل السنة - گویا کرامت کا مفہوم یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرب و صالح بندہ جب اپنا ہر کام رضائے الہی کے لیے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی ایک عزت ہوتی ہے لہذا جب کبھی وہ کسی موقع پر اپنی زبان سے ایسی بات نکال بیٹھے جو عادتاً مشکل نظر آتی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کی لاج رکھتے ہوئے اُس بات کو سچا ثابت کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں اُس صالح مردِ خدا کا سر شکر سے جھک جاتا ہے اور وہ بارگاہِ مولیٰ میں سر بسجود ہو کر بزبانِ پیر مہر علی شاہؒ یوں عرض کرتا ہے۔

توئی کہ ذرّہ صفت را بہ آسماں بُردی

چہ گو نہ شکر تو گوید کمینہ ، بندہ نواز!

نہ یہ کہ وہ اس پر اُکڑتا ہے اور نہ ڈینگیں مارتے ہوئے اس خارقِ عادت فعل کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ جب کرامت کا مفہوم ہی وہ عزت و تکرمیم ہے جو اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے ہاں بندے کو حاصل ہوتی ہے تو دلائلِ قطعیہ (آیات و احادیث) کی روشنی میں سب سے بڑی عزت بندوں کے لیے اللہ کے ہاں علم والی ہے، جیسا کہ ابھی کچھ پہلے بیان ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یرفع الله الذين امنوا منكم والذين اوتوا العلم درجت، اور خیار اُمّتی علماء ہا و خیار علماء ہا فقہاؤہا کے اعتبار سے بھی کرامتِ اعلیٰ علم ہی کو حاصل ہے، باقی سب چیزوں کو بعد میں اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کرامتِ علمی کو حاصل ہے چنانچہ آپ کے سوانح حیات ”مہرِ منیر“ کے صفحہ 577 پر مندرج یہ عنوان اور اس کے تحت مندرج چند سطور ملاحظہ ہوں

علوم لدنیہ کی کرامت عظیمہ

”حضرت کی دوسری عظیم الشان کرامت آپ کے علم بیکراں کی وہ خداداد دولت تھی، جو ہمہ وقت جلو میں دست بستہ حاضر رہتی کہ جس طرح چاہتے تھے صرف میں لے آتے جس کے دُربائے ابدار تصنیفات اور ملفوظات میں بکھرے نظر آتے ہیں۔“ ان سطور پر غور فرمائیں کہ علم حضرت گولڑویؒ کی کرامت عظیمہ ہے اور شاید کوئی کج فہم یہ کہے کہ لفظ ”دوسری“ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے نمبر کی کرامت کوئی اور ہے اور شاید کرامت حسی ہو ہرگز نہیں بلکہ یہ پہلا اور دوسرا نمبر مؤلف ”مہر منیر“ نے افہاماً یعنی سمجھانے کے لیے دیا ہے یعنی یہ ترتیب استفہامی ہے ترتیب حقیقی اور ترتیب رُتبی نہیں۔

مرزائے قادیانی کے مقابلے میں بھی آپ کی اسی کرامت عظیمہ کا اظہار ہوا تھا اور ہوا ہی نہیں تھا بلکہ کرایا گیا تھا۔ چنانچہ ”مہر منیر“ کے صفحہ 203 پر مندرج یہ پیرا خصوصی توجہ سے پڑھیں۔

ملفوظات طلیات میں درج ہے کہ حضرت قبلہ عالم قدس سرہ نے فرمایا کہ عالم رویا میں آنحضرت ﷺ نے مجھے مرزائے قادیانی کی تردید کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”یہ شخص میری احادیث کو تاویل کی قینچی سے کتر رہا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔“

اس اقتباس کو بغور پڑھنے سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے حضرت گولڑویؒ کو حکم دیتے ہوئے جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ آپ کی ذات میں موجود وصف علم کی بنیاد پر ہی تھے کیونکہ جو شخص علم حدیث میں مہارت تامہ نہ رکھتا ہو وہ کسی ایسے بے دین کو لگام کب دے سکتا ہے جو احادیث شریفہ کو تاویلات کی قینچی سے کتر رہا ہو۔ تاویلات فاسدہ کا ردِ بلیغ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص خود بھی علم حدیث شریف میں ماہر ہو، احادیث کے متن اور سند پر عمیق نظر رکھتا ہو، اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل پر بھی عبور رکھتا ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ ردِ قادیانیت کے لیے آپ کو علم کی کرامت عظیمہ کے سبب ہی مأمور کیا گیا تھا، ورنہ دربار رسالت مآب ﷺ سے یہ حکم

اُس وقت کے کسی زاہد محض یا خشک اور اُن پڑھ صوفی پیر کو بھی دیا جاسکتا تھا۔ ذرا سوچیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب اس عظیم خدمت کیلئے آپ کو منتخب ہی وصف علم کے سبب کیا گیا، اُسی کی نفی کر کے کہا جائے نہیں نہیں علم کی وجہ سے آپ کو یہ خدمت سپرد نہیں کی گئی تھی بلکہ محض صاحب کرامت بزرگ ہونے کی وجہ سے یہ کام آپ سے لیا گیا۔ یا یہ کہ آپ ایک مادر زاد ولی تھے اور اس فتنہ عظیمہ کی سرکوبی کے لیے ایک مادر زاد ولی کا ہونا ضروری تھا۔ قارئین! حضرت پیر صاحب گولڑویؒ کے مادر زاد ولی ہونے کا ہم انکار نہیں کرتے، لیکن محض خوش عقیدگی کی رد میں بہہ کر حقائق سے آنکھیں چرانا بھی کوئی مناسب بات نہیں؛ جب آپ مادر زاد ولی تھے تو ایک ولی کے لیے ولی ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ اُس کے لیے کیا ضروری ہے کہ وہ ضربِ بضرِب کی گردانیں یاد کرنے میں ضیاع وقت کرے اور اُستادوں کے جوتے اٹھاتا پھرے گھر بار چھوڑے، عیش و آرام کو خیر باد کہہ کر گاؤں کے محلوں اور گلیوں میں جا جا کر کٹڑے مانگے اور دوسرے عام طلبہ کی طرح زنجیل گدائی لے کر ہر ایرے غیرے کے دروازے پر صدائیں لگاتا پھرے۔ مگر یہ سب نہ صرف حضرت گولڑویؒ نے کیا بلکہ ہمارے اکابر امت انہی صبر آزمایا مراحل سے گزرے اور اسے اپنے لیے اعزاز تھوڑا کیا۔ کیونکہ اُس وقت آج کی معاشی وسعتوں کا نام و نشان تک نہ تھا معلوم ہوا کہ حضرت گولڑویؒ کے والد ماجد بھی یہ سمجھتے تھے کہ محض کسی عالی گھرانے میں پیدا ہو جانے سے انسانی عظمتوں کی بلند یوں کو نہیں چھو جاسکتا بلکہ بقول شیخ سعدیؒ۔

پئے علم چوں شمع باید گداخت

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

کے تحت مہر شاہ کو پیر مہر علی بنے تک کے مراحل علم ہی کے ذریعے طے کرنا ہوں گے چنانچہ اپنے اِس ذہین فرزند کو حصول علم کے لیے دُور دراز شہروں میں بھیجا اور راہِ دین میں اپنے اِس لختِ جگر کی جدائی کو بہ سرو چشم قبول کیا۔ اگر محض نماز، روزہ اور اُوراد و وظائف خوانی ہی سے مرزائیت جیسے

صبر آزمائے سر ہو سکتے تو اُس وقت موجود حضرت گولڑویؒ کے بعض بزرگ افراد خانوادہ بھی سر کر لیتے۔ مگر سب نے دیکھا کہ یہ کام پیر سید نذر الدین گیلانی کا صرف ایک بیٹا ہی سر انجام دے سکا اور وہ بھی توفیق الہی اور اپنے خداداد علم و صلاحیت کے بل بوتے پر۔

حضرت گولڑویؒ نے جو مصائب و شدائد برداشت کرتے ہوئے علم حاصل کیا اور پھر علم و فضل کی جن بلندیوں تک پہنچے وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔ یہ محض کرامت ہی نہ تھی بلکہ بقول راقم الحروف۔

آسمان سے کوئی پوچھے یہ تنگ تاب ہلال

کن مراحل سے گزرتا ہے قمر ہونے تک

مادر زادو ولایت کا جو مفہوم ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اُس اعتبار سے وہ ایک ایسے جوہر قابل کے مالک تھے کہ تائید ایزدی بچپن ہی سے اُن کے ساتھ رہی۔ اس قسم کی مثالیں اُمت کے دیگر اکابر کے ہاں بھی ملتی ہیں مگر یہ کہنا کہ کسی جوہر قابل کو علوم ظاہری کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، یہ سراسر غلط ہے۔ میرے دادا حضرت بابو جیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے صرف اس بات پر ناز ہے کہ میرے والد ماجد علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے اور اُن کے دور میں علوم و فنون کے اعتبار سے اُن کا کوئی ہمسرہ نہ تھا۔ حضرت بابو جیؒ کو میں نے کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ میرے والد ماجد کرامات میں بے مثل تھے یا یہ کہ وہ ایک مادر زاد ولی یا عالی نصب سید تھے۔ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں کرامات و ولایت کے جوہر بھی رکھے تھے اور وہ زہد و تقویٰ اور تزکیہٴ نفس جیسی صبر آزمائے بات گاہوں سے گزر کر انسانیت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے مگر جس چیز نے انہیں ان مراتب اعلیٰ پر فائز کیا وہ صرف علم شریعت اور پھر اُس پر عمل تھا جو اہل فضل کے نزدیک ہر کمال تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ محض کرامات معروفہ کا صدور تو مجاذیب سے بھی ہو سکتا ہے بلکہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ مگر دنیاۓ تصوف میں ایسے لوگ رشد و ہدایت کے قابل نہیں ہوا کرتے اور نہ اُن کا کوئی قول و فعل نمونہ و حجت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے بے شمار مجذوبوں اور نائکے فقیروں کے حالات میں پڑھا ہے کہ ان کے ہاتھ پر

بعض ایسی ایسی کرامات معروفہ فی العوام کا صدور ہوا کہ انسانی عقل حیرت میں پڑ گئی کہ بظاہر اُن کی تعلیم کچھ بھی نہیں ہوتی مگر جو کہہ دیتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے۔ بائیں ہمدانیہ مجاذیب کو اہل طریقت اُن ذی علم مشائخ کا درجہ کبھی نہیں دیتے، جو جامع معقول و منقول ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاۓ شریعت و طریقت میں حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت بابو جیؒ ”میر منیر“ میں حضرت گولڑویؒ سے منسوب کرامات کا باب حذف کر دینے کا اصرار کرتے رہے۔ مگر آج کے بعض ذہین چونکہ علم سے بہت دُور ہیں اس لیے وہ ایسے قصوں اور کہانیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسے انسان کے باکمال ہونے کا معیار تصور کرتے ہیں۔ اکابر اولیاء کی تصانیف میں کرامات کو ایک عام عمل قرار دیا گیا اور اسے اثبات ولایت کے لیے دلیل محض نہیں کہا گیا بلکہ بعض اولیاء سے جب کرامت کا صدور ہوتا تھا تو وہ دُرتے رہتے تھے کہ کہیں اس میں ہمارے لیے کوئی آفت نہ ہو کیونکہ بعض اوقات بطور مکر الہی بھی ایسا کر دیا جاتا ہے کہ بندہ گناہ کر رہا ہوتا ہے مگر اُس کے ہاتھ پر خوارق و کرامات کا ظہور ہو رہا ہوتا ہے۔ تاکہ یہ اسی مہلت اور ڈھیل میں خوش ہو کر مزید گمراہیوں کی دلدل میں دھنستا چلا جائے۔ اسی بات کو فاضل اجل ہمام اکمل فرید العصر و حید الدھر السید الشریف علی بن محمد البحر جانیؒ نے ”کتاب التریفات“ میں یوں بیان فرمایا ہے۔

(المکر) من جانب الحق تعالیٰ هو ارداف النعم مع المخالفة و ابقاء الحال مع سوء الادب و اظهار الکرامات من غیر جہد (یعنی باوجود مخالفت احکام الہیہ کے مسلسل نعمتوں کا ملنا سوء ادب کے باوجود حال و کیفیت کا برقرار رہنا اور بغیر جہد و کوشش، محنت و سعی عمل کے بھی خوارق و کرامات کا ظہور، یہ بندے کے حق میں ایک مکر (خفیہ تدبیر) بھی ہو سکتی ہے اور شاید اسی کو استدرج بھی کہتے ہیں جس کے معنی ”اندک اندک نزدیک کردن عذاب“ کے ہیں یعنی بے ایمان اور بے عمل بندے کو خوارق کے ظہور کے نشے میں مست کر کے تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ عذاب کے قریب کر دیا جائے، یہاں تک کہ اُس کے لیے واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو جائے اور وہ واللہ خیر المکرین کے مفہوم کا مزہ اچکھ لے۔

آپ کو تصوف کی معتبر ترین کتب میں یہ مقولہ ملے گا الاستقامة فوق الكرامة شریعتِ مطہرہ پر استقامت، کرامت سے کہیں برتر و بالا ہے۔ کسی بزرگ کی ولایت کو پرکھنے یا اُس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے لیے اُس سے کثیر کرامات کا صدور کوئی ایسا پیمانہ نہیں جسے کتبِ تصوف میں معیارِ فضیلت و ولایت بنایا گیا ہو، بلکہ علمِ شریعت میں مہارت، عمل و کردار میں استقامت اور خدماتِ دینیہ کو معیار قرار دیا گیا، جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں جو مقام و مرتبہ اور فضیلت و افضلیت رکھی گئی ہے وہ کثرتِ معجزات کے سبب نہیں بلکہ وہ کوئی اور چیز ہے۔ اسی لیے افضل الانبیاء سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے اس قدر معجزات کا ظہور نہیں ہوا جتنا دیگر انبیاء علیہم السلام سے ہوا، حالانکہ آپ کی فضیلت تمام انبیائے کرام پر مسلمہ ہے امام شرف الدین بوسیریؒ قصیدہ برودہ شریف میں یہی حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں۔

لو ناسبت قدره اياته عظاماً

أحیی اسمہ حین یدعی دارس الرّم

اگر آپ کے مقام و مرتبہ حقیقی کی مناسبت سے آپ کی ذاتِ گرامی سے معجزات و خوارق کا ظہور صدور ہوتا تو فقط آپ کا نام پاک لینے ہی سے مردہ اور بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جاتیں لیکن اُن کے متبادل آپ کو ایسا دائمی، ابدی، اکمل اور آفاقی معجزہ عطا کیا گیا جس کی مثال کہیں کسی نبی کے پاس نہیں ملتی اور وہ قرآن مجید ہے۔ قرآن شریف حقائق و معارف اور علوم و حکم کا خزانہ ہے اس میں صرف خوارق و کرامات کے نسخے نہیں، بلکہ یہ رہتی دنیا تک ایک نسخہ کیسیا ہے۔

دیکھیں صحابہؓ اور اہل بیتؓ سے زیادہ کون ولی ہو سکتا ہے مگر آپ اُن کے حالات پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ اُن کی استقامت ہی استقامت نظر آئے گی۔ کرامت کا وہ مفہوم جو بعد والوں میں رائج ہوا صحابہؓ اور اہل بیتؓ کے ہاں وہ آپ کو کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔ انہوں نے شریعت کے احکام پر کار

بندی اور استقامت ہی کو اپنا مقصدِ حیات جانا، اس لیے کہ اُن کو یہی تعلیم خود قرآن مجید نے ان الفاظ میں دی اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا۔ جب انسان استقامت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو پھر کربلائے وقت میں حسینؑ ابنِ علیؑ کرم اللہ وجہہ کی صفاتِ عالیہ کا مظہر بن کر دنیا کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اور اُن کے افرادِ خانہ نے کربلا میں آخری دم تک صرف استقامت ہی کا مظاہرہ کیا آخر حق و باطل کے اتنے بڑے معرکے میں اپنی کوئی کرامت کیوں نہیں دکھائی۔ کیا معاذ اللہ وہ مادرِ زاد ولی یا کرامت دکھانے کے اہل نہ تھے؟ اگر امام حسینؑ سے کوئی کرامت ظاہر بھی ہوئی تو وہ فتحِ معرکہ کربلا کے لیے نہیں بلکہ اپنی صداقت کے اظہار اور اتمامِ حجت کے لیے تھا۔ نعوذ باللہ متاخرین اولیائے امت، صحابہؓ اور اہل بیتؓ سے ولایت اور باطنی کمالات میں زیادہ تو نہ تھے۔ ہمیں کرامت کے وجود سے انکار نہیں، البتہ اس کی دورِ حاضر میں مروجہ تعریف اور استعمال سے اختلاف ضرور ہے اور بالخصوص جب کرامتِ حسی کو کرامتِ معنوی یعنی علم پر فوقیت دی جاتی ہے تو حیرت ضرور ہوتی ہے اگر کرامات کا مقام علم سے زیادہ ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ چراغِ امت امام ابوحنیفہؒ سے جہاں علمی و تحقیقی کمالات جس کثرت سے ثابت ہیں، وہاں کرامات کے ظہور کا پتہ ہی نہیں ملتا اور نہ انہوں نے خود کبھی اپنے ایسے کمال کو بطور نمونہ پیش کیا البتہ جہاں بھی ضرورت پڑی کرامتِ علم کا اظہار بڑھ چڑھ کر کیا۔ یہی حال امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ کا ہے۔ انہوں نے اور اُن جیسے ہزاروں آئمہ وقت نے اپنے حریفوں کو محض اپنی علمی طاقت اور دلائل کی قوت سے شکست دی، آخر بڑے بڑے مناظروں میں ہمارے ان آئمہ نے کوئی کرامت کیوں نہیں دکھائی اور پھر کرامت پر محمول کوئی دعویٰ کیوں نہیں کیا؟ معلوم ہوا کہ کرامت کا وہ مفہوم جو ہم عرف عام کے حوالے سے سمجھتے اور بیان کرتے ہیں وہ درست نہیں۔ ورنہ مذکورہ بالا شخصیات کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آیا یہ لوگ کرامات دکھانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا پھر یہ لوگ مادرِ زاد ولی نہ تھے؟ شیخ سعدیؒ نے اسی حقیقت کو اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں یوں واضح فرمایا۔

کرامت جواں مردی و ناں دہی ست
مقالات بے ہودہ طبل تہی ست
طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اسی طرح بعض لوگوں کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ پیر مہر علی شاہ صاحبؒ نے قادیانیت کا معرکہ محض کرامت سے سر کیا۔ اگر یہ بات ہوتی تو پیر صاحبؒ گوڑہ شریف میں بیٹھے بیٹھے مرزا کو اپنے سامنے حاضر کر لیتے اور کرامت کے زور پر اُسے عقائد کفریہ و دعاوی کا ذبہ سے تائب ہونے پر مجبور کر دیتے، مگر پیر صاحبؒ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اُس کی دعوت پر لاہور تشریف لے گئے اور علمی گفتگو اور دلائل کی روشنی میں احقاقِ حق و ابطالِ باطل کرنا چاہا۔ آج کل اسی مناظرے کے حوالے سے ایک فقرہ خطیب حضرات بہت دہراتے رہتے ہیں پیر صاحبؒ نے فرمایا ”تم اپنا ج اور برص کے مریض کو تندرست کر دینے کی بات کرتے ہو میرے سامنے اگر مُردہ بھی لاؤ تو میں اُس مُردہ کو بھی زندہ کر دوں گا“

اول تو حضرت صاحبؒ نے یہ الفاظ یوں نہیں فرمائے ہوں گے کیونکہ ایسے الفاظ کہنا آپ کے مشرب و مزاج کے خلاف ہیں لیکن (علی وجہ التسلیم) اگر آپؒ نے فرمائے بھی ہوں تو وہ اپنی کسی کرامت یا کمال کے اظہار کی نیت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ اگر میں اس کے دین کی حفاظت کے لیے میدان میں نکلا ہوں تو وہ یقیناً مجھے رسوا و شرمندہ نہیں کرے گا بلکہ میرے منہ سے نکلے کلمات کی لاج رکھے گا اور یہ بات بھی آپؒ نے مرزا کی چال بازیوں اور حیلہ سازیوں کے جواب میں کہی تاکہ وہ کسی طرح سامنے آئے اور اُس سے علمی گفتگو کر کے اُس کا کذب پوری دنیا پر واضح کیا جاسکے۔ مسئلہ ختم نبوت چونکہ خالصتاً علمی مسئلہ ہے اگر اسے بزور کرامت حل کرنے کا ارادہ ہوتا تو آپؒ خمس الہدایہ اور سیفِ چشتیائی جیسی معرکہ الآراء کتابیں تصنیف نہ فرماتے۔ ان کتابوں کی تصنیف پر آپؒ نے جس قدر محنت فرمائی اور قرآن و سنت

کے علاوہ جن جن علوم و فنون کی کتابیں حوالہ جات کے لیے کھنگالیں اور ایک عرصہ لگایا تو کیا آپؒ نے یہ سب کچھ ویسے ہی یا اتفاقاً ہی کر دیا۔ ایسی بات ہرگز نہیں بلکہ آپؒ نے یہ سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اور قوتِ کرامت سے زیادہ اپنی قوتِ علمیہ کو فوقیت دی۔ اگر بالفرض وہ اپنی کرامت کے زور پر مرزا قادیانی کو جان سے مار دیتے تو مخالفین یہ کہتے کہ میدانِ عمل میں اترنے کی جرأت نہ تھی اسی لیے یہ اوچھا حربہ اختیار کیا۔ مگر پیر صاحبؒ نے اس موضوع پر دو ایسی کتابیں تصنیف فرمادیں جو آپ کی علمی کرامت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور کرامتِ حسی کی حیثیت ان کے سامنے نیچ ہے۔ قیامت تک ختم نبوت کے موضوع پر ریسرچ کرنے والے انہیں پڑھیں گے اور آنے والی نسلیں آپؒ کی اس علمی کرامت سے حیاتِ نو حاصل کرتی رہیں گی۔ کرامتِ حسیِ دقتی اور عارضی چیز ہوتی ہے جس کی عینی شہادت سے مستقبل کا دور محروم رہتا ہے اور جس کی حقائق کو قبول کرنے کے لیے ہزار ہا دوسو سے ذہن میں جنم لیتے رہتے ہیں، مگر سیفِ چشتیائی اور خمس الہدایہ جیسی علمی کرامات لافانی ہوتی ہیں، جنہیں ہر دور کا بیدار مغز خود دیکھ اور پڑھ سکتا ہے۔ بلکہ اُس وقت بھی محقق علماء و غیر جانبدار اکابر نے حضرت پیر مہر علی شاہؒ کی تعریف و توصیف، آپؒ کی علمی و تحقیقی نگارشات و تالیفات کے حوالے سے ہی کی بلکہ کرامات و تصوف کے دلدادہ بزرگوں نے بھی اسی پہلو سے آپؒ کو سراہا۔ ”مہر منیر“ کا یہ اقتباس اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ ہے

حضرت کی یہ تصنیف یعنی سیفِ چشتیائی اپنے نادر استدلال، بلند پایہ علمی مضامین اور مسئلہ زیر بحث پر سوال و جواب کے پیرایہ میں واضح اور دلنشین انداز اور تجزیہ کے باعث نہایت مقبول ہوئی اور آج نصف صدی گزرنے پر بھی بار بار طبع ہو کر ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی ہے۔ بلند پایہ علماء کے طبقہ میں تو بالخصوص اس کی بہت مانگ ہے مولوی اشرف علی تھانوی اپنی تفسیر بیان القرآن میں آیت وَ قَوْلُهُمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ۔ (سورۃ نساء آیت نمبر 157) کے ذیل لکھتے ہیں

”اور حیات و موت عیسوی کی بحث میں کتاب سیفِ چشتیائی قابلِ مطالعہ ہے“ اسی طرح دیو

بند کے شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام کے دیباچہ میں سیفِ چشتیائی کو مسئلہ حیاتِ مسیح پر ایک بہترین اور کافی وافی تصنیف قرار دیا ہے.... ہندوستان کے مشہور مفتی، عالم اور ریاست رام پور میں مدرسہ عالیہ کے پرنسپل مولانا فضل حق رام پوری نے ایک سال اجیر شریف میں عرس کے موقع پر حضرت بابو جی مدظلہ العالی (علیہ الرحمۃ) سے حضرت قبلہ عالم قدس سرہ العزیز کی تصنیف کے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”یوں تو حضرت کے کمالات بہت بیان ہوئے ہیں لیکن میں تو اُس دماغ کا شیدائی ہوں جس سے سیفِ چشتیائی ظہور میں آئی“ (مہر منیر صفحہ نمبر 250، 251 مطبوعہ گولڑہ شریف 1987ء)

اگر اس وصفِ عالی کو ”والفضلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الاعداء“ کے تناظر میں آپ حضرت پیر مہر علی شاہؒ کی علمی کرامت نہیں کہیں گے تو آخر اس کا اور کیا نام رکھیں گے؟

پیر ہرات حضرت عبداللہ انصاریؒ جو حضرت ابوالباب انصاریؒ (میزبان رسولؐ) کے پڑپوتے ہیں اپنے اقوال میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ”اگر برہو اپری مگسے باشی، وگر برہو آب روی خسے باشی، دل بدست آرتا کسے باشی“ یعنی تُو اگر ہوا پر بزرور کرامت اڑتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ تُو ایک مکھی ہوگا کیونکہ وہ بھی تو اڑ لیتی ہے اور اگر تُو پانی پر چل لیتا ہے تو تیری حیثیت تنکے سے زیادہ نہیں کیوں کہ تنکا بھی سطحِ آب پر تیر لیتا ہے۔ ہاں اگر تُو نے کچھ بنا ہے تو کسی انسان کا دل راضی کر، خلقِ خدا کی دعائیں لے تاکہ تُو انسانوں کے زمرے میں داخل ہو سکے۔ یاد رہے کہ عبداللہ انصاریؒ وہ شخصیت ہیں جنہیں مولانا جامیؒ نے پیر ہرات کا لقب دیا اور اُن کی تعریف میں متعدد شعر کہے جو اُن کے مزار پر آج بھی کندہ ہیں۔ حضرت بابو جیؒ کے ساتھ جب میں ہرات میں اُن کے مزار پر حاضر ہوا تو میں نے وہ اشعار وہاں لکھے ہوئے دیکھے تھے۔ علاوہ ازیں یہ کہ فارسی عبارت میں صرف شیخ سعدیؒ ان کے اسلوبِ تحریر کا تتبع کر سکے چنانچہ گلستانِ سعدیؒ کی دلپذیر عبارت اور سچے ٹکے حکمت آمیز جملے اس دعویٰ کی تین دلیل ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ پیر ہراتؒ نے بھی محض کرامات کو معیارِ بلندی درجات تسلیم نہیں کیا۔ لہذا عوام کے سامنے بزرگانِ دین کی

کرامات کے محض قصے بیان کرنے کے بجائے اُن کی علمی خدمات اور قابلیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ایک پڑھا لکھا انسان اور میڈیا کے اس دور میں سانس لیتا ہوا ایک باشعور ذہن جس قدر علمی دلائل سے قائل ہوتا یا ہو سکتا ہے وہ کرامات کے قصے کہانیاں سنانے سے نہیں ہوتا، کیوں کہ جس کرامت کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ اُس نے پنچشم خود دیکھی ہی نہیں کہ وہ اُسے تسلیم کر سکے، بلکہ ایسے موقع پر آزاد خیال لوگ کہہ دیا کرتے ہیں بقول حافظؒ۔

با خرابات نشیناں ز کرامات ملاف

ہر سخن جائے دہر نکتہ مکانے دارد

جبکہ کتاب اور علمی دلائل ایسے زندہ جاوید کرامات ہیں کہ قیامت تک آنے والا ہر معقول اور ذہین انسان انہیں سمجھ لینے کے بعد اُس شخصیت کو خراج عقیدت پیش کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن درگاہوں میں واعظین اور خطباء زیادہ تر صاحبِ مزار کے کرامات بیان کرنے پر زور دیتے ہیں اور اُن کے پیش کردہ علمی نکات بطور درس و تدریس عوام کے سامنے نہیں لاتے یا لانے کی اہلیت نہیں رکھتے، وہاں محفل میں آنے والے پڑھے لکھے غیر جانبدار حضرات معترض ہوتے ہوئے کہتے ہیں دیکھئے! یہ لوگ بزرگوں سے منسوب کرامات کے پلندے عوام کے سامنے اس لیے کھولتے ہیں کہ جاہل عوام اُس پیر کو بہت بڑا پیر سمجھ کر اُس کے دیوانے بن جائیں۔ یہ خوشامدی خطیب پیروں کی دکانیں چکانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک خطباء کا یہ عمل عوام الناس کو پھانسنے اور صرف پیروں کو مرکزِ توجہ بنانے کا محض ایک داؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے ختمی الوسع صوفیائے کرام کی تعلیمات اور علمی خدمات کو زیرِ بحث لانا چاہئے۔ اسی لیے سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے حضور علیہ السلام کے بارے میں ایک سوال پر فرمایا تھا ”تَحْنُ خُلُقُہُ الْقُرْآن“ کہ آپؐ کے اخلاقِ عالیہ قرآن مجید کی تفسیر تھے۔ یہاں بھی ام المؤمنینؓ نے حضورؐ کے کسی معجزہ کو بیان کرنے کے بجائے آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کا تذکرہ فرمایا، حالانکہ آپؐ کی ذاتِ اقدس جامع المعجزات ہے چونکہ معجزات کا ذکر انسانی

زندگی پر براور است اثر انداز نہیں ہوتا، جس قدر آپ کے اخلاقی عالیہ اور طرز حیات اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس لیے حضرت عائشہؓ نے اخلاقی عالیہ کو ذکر معجزات پر فوقیت دی اور آپ کی پوری حیات طیبہ کو قرآن کی عملی تفسیر فرمانے پر اکتفا کیا۔

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرت گولڑوئیؒ نے پھر یہ کیوں فرمایا تھا کہ جس کا قلم خود اٹھ کر لکھے وہ حق پر ہوگا اور یہ کہ ایسے لوگ بھی امت محمدیہ میں موجود ہیں کہ اگر ان کے سامنے مردہ بھی پیش کیا جائے تو وہ اسے زندہ کر دکھائیں یہ بات تو حضرت گولڑوئیؒ کے باکرامت ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ حضرت گولڑوئیؒ کے باکرامت ہونے میں کم از کم مجھے تو کوئی شک نہیں، میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ علم اور کرامت کے مابین فرق مراتب کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ علم کا یہ مطلب نہیں کہ اُسے حصول مال و دولت کے لیے حاصل کیا جائے یا محض لفظوں سے کہنے کے لیے سیکھا جائے یا اپنی علمی برتری و تفوق ظاہر کرنے کے لیے یا مناظرہ بازی کے لیے پڑھا جائے، میں تو اُس علم کی بات کر رہا ہوں جو محض اللہ اور اُس کے رسولؐ کے دین کی خدمت کے لیے حاصل کیا جائے اور پھر اُس علم کے مقاصد حصول کو سامنے رکھتے ہوئے الفاظ کی دنیا سے جہانِ معنی میں بھی قدم رکھا جائے۔ ایسا علم اُس طالب علم کو عارف ذات و صفات بنا دیتا ہے اور جب عرفان الہی حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کا قلب انوار الہیہ سے جگمگا اٹھتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے عالم کی زبان سے نکلا ہو ایک ایک لفظ تیر بہدف ثابت ہوتا ہے اور اُس کے اندر تاثیر کی وہ دنیا پنہاں ہوتی ہے کہ سماعتیں رقص کرنے لگتی ہیں۔ قال حال میں بدل جاتا ہے۔ الفاظ میں معانی دکھائی دینے لگتے ہیں یہ وہ منزل ہے کہ جہاں سکوت، گویائی کا کام دینے لگتا ہے اور گویائی دلوں میں ایک کھرام مچا دیتی ہے بقول مولانا رومیؒ۔

علم را بر دل زنی یارے بود

علم را بر تن زنی مارے بود

بلاشبہ میرے جدِ اعلیٰ حضرت پیر مہر علی شاہؒ ایسے ہی علم کے وارث تھے۔ اُن کا علم بجائے خود ایک کرامت کے درجے پر فائز ہو چکا تھا۔ لیکن یہ کسی ایک ذات سے مخصوص نہیں، بلکہ جو بھی اس تجربہ گاہ سے گزرے، بشرطیکہ فصلِ ایزدی بھی اُس کے شامل حال ہو، تو وہ اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ جہاں تک حق و باطل کے معرکے کی بات ہے تو جب اللہ تعالیٰ حق کو کسی کے ہاتھ پر ثابت کرنا چاہتا ہے تو اُس کے ہر دعوے کو بھی سچا کر دکھاتا ہے۔ اسے بندے کی طرف منسوب ہونے کے اعتبار سے تو کرامت کہا جاسکتا ہے، مگر حقیقتاً یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے، اس میں بندے کے ذاتی ارادے اور تصرف کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ حضرت گولڑوئیؒ نے اسی اہل حقیقت کی طرف اشارہ خود بھی کر دیا ہے ”مہر منیر“ کے صفحہ 234 پر آپ کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ ”میں نے دعویٰ از خود نہیں کیا تھا، بلکہ عالمِ مکاشفہ میں جنابِ نبی کریم ﷺ کے جمالِ باکمال سے میرا دل اس قدر قوی اور مضبوط ہو گیا تھا کہ مجھے یقین کامل تھا کہ اس سے بھی بڑا دعویٰ کرتا تو اللہ تعالیٰ ضرور مجھے سچا ثابت کرتے۔“ معلوم ہوا جب کرامت صادر ہو جائے تکبر و غرور کر کے اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اسے فصلِ باری تعالیٰ ہی قرار دینا چاہئے، جیسا کہ دربارِ سلیمانؑ میں آنکھ جھپکنے کی دیر میں تختِ بلقیس حاضر کیا گیا، چاہے وہ کسی فرشتہ کا کام تھا، عالمِ کتاب ولی کا کارنامہ یا بذاتِ خود حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ (جیسا کہ سب تفسیر کے حوالہ سے تحریر کر دیا گیا ہے) حضرت سلیمانؑ نے فوراً فرمادیا ہذا من فضلِ ربی لیبلوننی ء أشکرُ أم اکفرُ۔ کہ یہ میرے رب کا فضل و کرم ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت۔ یہاں سلیمان علیہ السلام نے اس کمال کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے اپنے لیے امتحان قرار دیا، حالانکہ پیہرِ انہ عظمت اور معجزانہ شان کے آگے ولایت و کرامت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، چہ جائیکہ کوئی ولی بطورِ مفاخرت، کرامت ظاہر کرے یا پھر اُسے اپنی طرف منسوب کرنے کی جرأت کر سکے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے آگ میں پھینکوا یا تو حضرت ابراہیمؑ کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ خود آگ میں کود کر پھر آگ کو ٹھنڈا کر دیں اور دنیا کو یہ باور کرائیں کہ میں صاحبِ معجزہ شخصیت ہوں

مگر جب نمرود نے آگ میں جبراً پھینکوا دیا تو پیغمبر کی استقامت، خلوص اور رب تعالیٰ پر توکل کامل کے انعام میں اللہ تعالیٰ نے آگ کو گلزار بنادیا چنانچہ قرآن کریم نے اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا:

قُلْنَا يٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ - ترجمہ: اور ہم (اللہ تعالیٰ) نے کہا کہ اے آگ! تُو ابراہیم کے لیے ٹھک ہو جا اور اُس کی سلامتی کا باعث بن جا۔ چونکہ یہ کفر و ایمان شرک و وحید اور حق و باطل کا ایک عظیم معرکہ تھا اس لیے اس کی تمام تر ذمہ داری اُسی ذات نے اپنے ذمہ لی، جس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود آگ کے ٹھنڈا ہو جانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آگ سے یہ کہا۔ نہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے از خود ایسا کہا اس سے ثابت ہوا کہ عرف میں ہم اسے معجزہ ابراہیمی تو کہہ سکتے ہیں، مگر قرآن مجید کی رو سے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا ظہور تھا۔ اسی طرح جہاں بھی قرآن مجید میں کسی نبی یا رسول نے کسی ایسی بات کو اپنی طرف منسوب کر کے کہا تو وہ بھی حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کے تحت فرمایا، یعنی اُس کا فاعل حقیقی بھی اللہ تعالیٰ ہی تھا انبیاء و رسل نہ تھے یہی بات اولیاء کی ہے، جب کسی حق بات کو ثابت کرنے کے لیے کمال یقین سے یہ لوگ زبان سے کوئی دعویٰ صادر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ حق کو ثابت کرنے اور اپنے بندگان خاص کو دشمنوں کے زور و شرمندگی سے بچانے کی خاطر اُن کے دعووں کو سچا ثابت کر دکھاتا ہے۔ حدیث شریف میں وارد لَوْ اَقْسَمَ عَلٰى اللّٰهِ لَا بَرَّةَ كَا مَفْهُوم بھی یہی ہے اور یہ منزل یقین علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ کلام یہ نکلا کہ حضرت گولڑوئیؒ کی سب سے بڑی کرامت اُن کا ظاہری علم تھا، جس سے مرعوب ہو کر مرزا قادیانی اُن کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کر سکا اور پھر اُس موقع پر حضرت گولڑوئیؒ نے کوئی حسی کرامت پیش بھی نہیں کی بلکہ صرف اُس کا ذکر فرمایا۔ اس کے برعکس اپنی علمی کرامت ایسی دکھائی کہ اُن کی مصنفہ شمس الہدایہ اور سیفِ چشتیائی دیکھتے ہوئے آج بھی دنیائے مرزائیت لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے اور اُن کی اس علمی کرامت اور دلائل و براہین کے ٹھٹھیں مارتے سمندر کے سامنے مرزائیت کی زور قی ناتواں جرأت مزاحمت نہیں کر پاتی۔ لہذا جن

حضرات کا خیال ہے کہ بزرگانِ دین محض کرامتِ حسی کے سہارے دشمن کو شکست دیتے ہیں، وہ شدید غلطی پر ہیں، اس لیے کہ کرامتِ حسی کرامتِ علمیہ کے سوا معرضِ وجود میں آ ہی نہیں سکتی اور پھر کرامتِ حسی اکابرِ صوفیاء کے نزدیک کوئی ایسا وصف بھی نہیں، جس کے سبب انسان پر دوسرے انسانوں کی نسبت فضیلتِ کلی کا حکم لگایا جاسکے۔

الغرض مرزائے قادیانی نے قبلہ پیر صاحب گولڑوئیؒ کی کرامتِ حسیہ کی شہرت سُن کر انہیں مناظرے کا چیلنج نہیں دیا تھا، بلکہ اُن کی علمی شہرت کے سبب انہیں میدانِ مقابلہ میں اترنے کی دعوت دی تھی، مگر جب دیکھا کہ وہ تو مقابلے کے لیے لاہور پہنچ گئے ہیں اور پھر وہ صرف کسی خانقاہ کے مجاور یا محض ایک رسی سجادہ نشین ہی نہیں، بلکہ وہ تو علومِ شرعیہ کے ایک بحرِ ذخار ہیں تو اُس نے خفت سے بچنے کے لیے شعبہ بازی پر محمولِ دعوے شروع کر دیے تاکہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کر دی جائے اور وہ (مرزا قادیانی) کسی طور پر پیرِ مہر علی شاہؒ کے ساتھ علمی گفتگو کرنے سے بچ سکے۔ پیر صاحبؒ نے جواب میں جو کچھ کہا وہی کچھ کہنا مناسب تھا۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر احقاقِ حق کے لیے ایک عام بندہٴ مومن کے دعوے کو بھی عملی شکل دے دیا کرتا ہے۔ یہ تو حضرت گولڑوئیؒ جیسے عالم و فاضل اور یگانہ روزگار انسان کا معاملہ تھا۔ لہذا حضرت گولڑوئیؒ نے مرزا قادیانی کے جواب میں اُس دن جو دعوے فرمائے اللہ تعالیٰ حق کو ثابت کرنے کیلئے انہیں ضرور پورا فرماتا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کرامات کا مقام علم سے کم ہے اور یہ کہ کرامات کے صدور کی بنیاد علم و تقویٰ پر ہے، علم کے بغیر جو شخص مقامِ ولایت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے دعوئی میں ہرگز سچا نہیں بلکہ وہ محض لوگوں کو فریب دیتا ہے اور ایسے واعظ و خطیب حضرات جو فضیلتِ علم اور بزرگانِ دین کے علمی کارنامے بیان کرنے کے بجائے فقط کرامات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں، وہ انسان کی طبعی اور نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چونکہ انسان طبعاً آجوبہ پسند واقع ہوا ہے اس لیے جب اس کے سامنے خلافِ عقل و عادت واقعات ذکر کئے جائیں تو یہ انہیں اُن واقعات کی نسبت جو عادت اور معمول کے مطابق ہوں ترجیح دیتا ہے اور اُن سے زیادہ اثر لپٹتا ہے۔ کرامات کی دنیا برحق

سہی، مگر عوام پر ان کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کو ترک کر دیتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات سے زیادہ چلہ کشی اور وظائف خوانی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تاکہ وہ ولی بن کر بزرگوں کی طرح کرامتیں دکھاتے پھریں۔ جاہل ہونے کے سبب رات دن کی اور ادخوانی اور چلہ کشی انہیں ولی بنانے کے بجائے پاگل اور دیوانہ بنا دیتی ہے چنانچہ اکثر کیس ہمارے سامنے آتے ہیں، پھر انہیں مینٹل ہسپتالوں میں زیر علاج رکھا جاتا ہے، حالانکہ مناسب حد تک اور ادخوانی و چلہ کشی علم والوں کے لیے کوئی مُضر چیز بھی نہیں، بلکہ مفید ہے مگر یکدم مرتبہ ولایت پر فائز ہونے کا شوق اکثر جاہلوں کو پاگل بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی علامت چوں کہ وظائف و اور ادخوانی اور چلہ وفاقہ کشی ہوتی ہے اس لیے ہم قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے براہ راست اُس مقام پر فائز ہو جائیں، جس کی بدولت ہم سے ضرورت کے وقت کرامات کا ظہور ہو سکے۔ عوام کا یہ اندازِ فکر اور طریقہ عمل خطیبوں کی اُن تقاریر کا مرہونِ منت ہوتا ہے، جو اولیاء کے محض کرامات کا تذکرہ کر کے محفل کو گرم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”مہر منیر“ میں حضرت گوڑویؒ کے ایک ایسے ہی جلد باز ہم درس مولوی سید احمد صاحب کا واقعہ درج ہے، جس کو ہم ”مہر منیر“ ہی کے صفحہ 95 سے نقل کرتے ہیں۔

(ایک دفعہ سیال شریف میں حاضری پر آپ ”حضرت گوڑویؒ“ کو معلوم ہوا کہ یہ مولوی سید

احمد وہیں درویشوں میں مقیم ہیں، مگر نماز وغیرہ فرائض ترک کر چکے ہیں۔ حضرت نے ملاقات پر انہیں فرمایا۔ ”ہم نے سنا ہے کہ تم میں سے انسانیت رخصت ہو چکی ہے اور صرف حیوانیت باقی رہ گئی ہے۔“ اُس نے کہا کہ میں آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ میری طرح تعلیم و تدریس ترک کر کے ذکرِ جہر اختیار کریں، کیونکہ تعلیم وغیرہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حضرت قبلہ عالم قدس سرہ نے فرمایا کہ قطع نظر تمہاری اس ظاہری حالت کے ترکِ تعلیم و تعلم سے اگر تم نے کوئی خاص فائدہ حاصل کیا ہے تو مجھے بتلاؤ تاکہ اُسے پیشِ نظر رکھ کر میں بھی تمہاری نصیحت پر غور کر سکوں۔ مجھے تم میں سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ تمام رات ذکرِ جہر کرنے کے باعث تمہیں قدرے رقتِ قلبی تو

حاصل ہو گئی، مگر اسے عرفان نہیں کہا جاسکتا کیونکہ جسے عرفان حاصل ہو جائے وہ اتباعِ نبوی ﷺ کا تارک ہرگز نہیں ہو سکتا)

قارئین کرام! اس مندرجہ بالا اقتباس کو بار بار پڑھیں، خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں اور پھر اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کریں کہ جب آدمی تعلیم و تدریس اور پڑھنے پڑھانے کو ترک کر دیتا ہے تو اُس میں سے انسانیت رخصت ہو جاتی ہے کیونکہ بقول شیخ سعدیؒ انسانیت کا کمال علم ہی کا مرہونِ منت ہے۔

بنی آدم از علم یابد کمال

نه از حشمت و جاہ و مال و منال

اور وہ محض حیوان ہو کر اسفل السافلین کے درجے پر آ جاتا ہے۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ذکرِ جہر پر جو رقتِ قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اُس کا نام ہرگز ہرگز عرفان نہیں کیونکہ عرفان تو اتباعِ نبوی ﷺ ہی کا نام ہے اور نبی کریم ﷺ تمام عمر اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا پر عمل فرماتے رہے، اور اپنے اس منصبِ جلیلہ کے فرائضِ عظیمہ ادا فرماتے رہے، جس پر آپ کو فائز کر کے فرمایا گیا و یَعْلَمُہُمْ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَہُ آپ نے کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے حیاتِ طیبہ بسر فرمائی نہ کہ اپنے صحابہ کرام کو کرامات دکھانے کی مشق کرواتے رہے۔

میرے دادا حضرت بابو جیؒ کے سامنے جب کوئی ایسا کیس پیش ہوتا کہ فلاں جاہل چلہ کش پاگل بن کر لوگوں کو تنگ کرنے لگ گیا ہے تو آپ نہایت غصے میں فرمایا کرتے تھے کہ تم اور ادخوانی اور چلہ کشی سے کیا بننا چاہتے ہو یا درکھو ان چیزوں کے لیے نیت کی درستی ضروری ہے اللہ تعالیٰ چلہ کشی اور درویشوں کے جال میں پھنسنے والا نہیں، وہ انسان کی نیت پر اپنا فیصلہ سنایا کرتا ہے اور ولایت و مقبولیت کا تعلق محض کسب و عمل سے نہیں، بلکہ یہ ازلی سعادت جس کے حصے میں کر دی گئی اُسی کو ملتی ہے، فضول نکریں مارنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ صوفیاء اور ادخوانی اور چلہ کشی بھی فرمایا

کرتے تھے، مگر اُن کی اساس علم شریعت تھا۔ جس کی بنا پر وہ ایک مخصوص مقام ولایت پر فائز ہو جاتے تھے۔ اگر علمائے کرام و خطباء حضرات اپنے مواعظ و خطبات میں مقاماتِ صوفیاء بیان کرتے ہوئے حصولِ علم کو بھی اساسی حیثیت دیتے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کی طرف عوام کو زیادہ راغب کرتے تو آج اور ادخوانی اور چلہ کشی کے ہاتھوں لوگ پاگل بننے سے بچ جاتے۔

اس ساری بحث کا مقصد نہ تو وجودِ کرامت سے انکار ہے اور نہ ہی بزرگانِ دین کے کمالات روحانیہ کی تردید، بلکہ اس جدید ترقیاتی دور میں روشن خیال طبقہ کو ایک پریکٹیکل اور عملی لائحہ عمل پیش کرنا ہے، کیونکہ آج کے دور کا پڑھا لکھا انسان قصے کہانیوں پر کان دھرنے کے بجائے ایک ٹھوس حقیقت کا متلاشی ہے، اسی لیے جس قدر اعتراضات آج کشف و کرامات پر کئے جاتے ہیں، شاید ہی کبھی پہلے کئے گئے ہوں۔ اگرچہ کچھ اعتراضات محض مخالفت و خصومت کی بناء پر بھی کئے جاتے ہیں، مگر مخالف کے ہر اعتراض کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے اغماض برتنا بھی قرین انصاف نہیں۔ اگر اُس کا مسکت و مدلل جواب پاس نہ ہو تو پھر اُسے تسلیم کرنا علمی دیانت ہے۔ غیر مدلل اور بھونڈے جوابات و قیوع اعتراضات کو زائل نہیں کر سکتے لہذا دیانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ مخالفین کے قیوع اعتراضات کا یا تو مسکت جواب دیا جائے یا پھر اُن کے وارد کردہ اعتراضات کو درست قرار دیا جائے۔ ہمارے اکابر علماء، فقہاء اور صوفیاء کا یہی چلن رہا۔ مخدوم ام علی ہجویری لاہوریؒ کی کتاب کشف المحجوب کے مطالعہ سے ایسے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں، آپ کا دور تقریباً تصوف کا ابتدائی دور ہے۔ آپ نے جو اعتراضات اپنے معاصر متصوفین پر وارد کئے۔ اُن کو پڑھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اگر خیر القرون قرنی کی حدیث سے قریب تر ادوار کا یہ عالم تھا تو بعد کے ادوار میں کس قدر بدعات، مختلف عقائد و رسوم کی صورت میں اسلامی معاشرے میں داخل ہوئی ہوں گی۔ اگر آج کا کوئی ناقد تصوف کے بعض معتقدات و رسوم پر اعتراض کرتا ہے تو یہ دیکھ کر اُسے منکرین تصوف میں شمار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ ایسے اور اس سے کہیں زیادہ قیوع اعتراضات خود صوفیائے کبار نے بھی صوفیاء پر کئے، جو نظم و نثر کی صورت میں اُن کی تصانیف میں آج تک موجود

ہیں۔ آخر اُن کو کس کھاتے میں رکھا جائے گا لہذا یہ کہنا کہ صوفیاء کے کسی قول، عمل یا اُن کی درگا ہوں میں رواج یافتہ رسوم پر اعتراض کرنا صرف مخالفین کا طریقہ ہے، غلط ٹھہرا کیونکہ اعتراض کا مقصد صرف تذلیل ہی نہیں ہوا کرتا، بلکہ بعض اوقات صورت حال شرعی دلائل کی روشنی میں سمجھنا مطلوب ہوتا ہے، ایسی صورت میں معترض کے اعتراضات کا جواب مدلل انداز اور شائستہ لب و لہجہ میں پیش کرنا چاہئے نہ کہ اوچھے اور بازاری انداز میں۔ ہمارے ذی علم مشائخ سلف کا یہی شیوہ رہا اور اُن کا یہ طرز عمل اُدع السبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة کی تفسیر تھا لہذا بقول علامہ سیما۔

اپنے معیارِ محبت پہ نگاہِ تنقید
نہیں معلوم یہ کس کس کی نظر سے گزرے

مخالفین تو یہاں تک بھی اعتراض کرتے ہیں کہ جب یہ سارا نظام حیات کراماتِ صوفیاء پر چل رہا ہے تو جس خالق نے یہ سب کچھ پیدا کیا اُس کی قدرت کے ظہور کی علامت اور وقت کو کیسے متعین کیا جائے گا کیونکہ مریدین اور عقیدت مندوں کے نزدیک اُن کے احوال میں جو اچھے بُرے اثرات ظاہر ہوتے ہیں وہ اُن کے پیروں کی توجہ و عدم توجہ کے مرہونِ منت سمجھے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرامات کی اس بھیڑ میں اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت دکھانے اور اپنی مخلوق پر اپنے تصرف کے اظہار کا وقت کب دیا جائے گا۔

اس مندرجہ بالا اعتراض کا مناسب اور قرین حقیقت جواب یہی ہے کہ ہمارے باکمال مشائخ سلف نے کبھی اور کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہمارے ماحول میں خیر و شر کا جو ظہور ہوتا ہے وہ ہماری توجہ یا عدم توجہ، خوشنودی یا رنجش کی بدولت ہوتا ہے۔ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے تو مشرک ہے بلکہ ہمارے باکمال مشائخ خیر و شر کے اس سارے ظہور کو مالکِ حقیقی کی قدرتِ کاملہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جاہل واعظین اور خوشامد پسند مریدین اگر اس سارے کھیل کو اپنے شیخ کی طرف منسوب کرتے

ہیں تو یہ اُن کا قصور ہے مثلاً سلف اس عقیدے اور انداز فکر سے براءت کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ خوشامدی واعظین اور باہل عقیدت مندوں کے ان مبنی بر جہالت عقائد نے پاکباز اور پاک نہاد مشائخ و صوفیاء کو بھی ٹافین کا نشانہ بنادیا ہے۔ حضرت پیران پیر کا مصرع مع لِقَامِ بِقُدْرَةِ الْمَوْلَى مَشَى لِي اس پر دلیل ہے کہ آپ نے میت کے اٹھنے کی نسبت قدرت باری تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے نہ یہ کہ وہ میری قدرت سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے یا یہ کہ میں صاحب کرامت و عزت ہوں یا پھر واقعہ تخت بلقیس کے ضمن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فرمانا، هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي اِىَّ اُثِلَ حَقِيقَتِ كِي طرف اشارہ ہے کہ سب کچھ کرنے والا قادر مطلق اللہ ہی ہے البتہ بندوں پر وہ کبھی کبھی اپنے فضل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

میں نے حضرت بابو جی کا بھرپور عہد دیکھا ہے، چونکہ وہ میری تعلیم کا دور بھی تھا اس لیے فرصت ملنے پر ہی آپ کی باتیں سننے کا موقع ملتا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا ذہن اُن کے ارشادات کی دولت سے خالی ہے بلکہ وہ افرق مدار میں آپ کے ملفوظات کا وہ علمی ذخیرہ جو توحید و رسالت، تصوف اور دیگر دینی و دنیوی موضوعات پر مشتمل ہے، اب تک پوری قوت کے ساتھ میرے لوح و ذہن پر نقش ہے، صرف اتنا افسوس ضرور ہے کہ جو کلمات آپ کی معیت میں نہ گزر سکے اور درس نظامی کی تکمیل کی وجہ سے جن مجالس میں شریک اور جن سزوں میں آپ کے ساتھ نہ جا سکا اُن کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ بقول شاعر۔

نالہ از بہر رہائی کند مرغ اسیر

خورد افسوس زمانیکہ گرفتار نہ بود

بہر حال پھر بھی ان شاء اللہ اپنے قارئین کو آپ کے ملفوظات کے سردی لطف سے محروم نہیں رکھوں گا۔ جو لوگ اکثر آپ کے ساتھ رہے اور جن کو مجھ سے زیادہ وقت آپ کی معیت میں گزارنے کا ملا اگر یہ کام وہ خود کر لیتے تو آج بات ہی کچھ اور ہوتی۔ میں نے بزرگ متوسلین سے سنا

ہے کہ لال کرتی والے منشی عبدالرحیم صاحب مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ماحول نے حضرت بابو جی کی قدر نہیں کی، صرف ساتھ وقت گزار لینے کو بہت کچھ سمجھا، مگر اُن کی گفتگو اور اُن کی شخصیت کی قدر قریب ترین رہنے والے بھی نہ کر سکے، منشی صاحب کی اس بات سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے آپ کے خطوط کی شکل میں جو چند چیزیں سامنے آئیں وہ بھی غنیمت ہیں، مگر وہ بھی آپ کے ابتدائی دور کے مشاہدات ہیں، آخری دور کے ملفوظات و مشاہدات کا احصاء نہ ہو سکا۔

محترم مفتی گل رحمن صاحب، زید مجدہ برنگھم (لندن) میں رہتے ہیں، جب میرے حالیہ سفر لندن میں مجھ سے ملے تو حضرت دادا صاحب کی شخصیت پر گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے ولایت کی جامع تعریف پوچھی۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں میں بھی اُسی مجلس میں حاضر تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ ولایت کرامات دکھانے کا نام نہیں، یا وہ شخص ولی نہیں جو صرف کرامات دکھائے بلکہ ولایت، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کھلی یقین رکھنے کا نام ہے کہ انسان ہر زاویہ فکر کے اعتبار سے اُسی کی ذات کو مرکز و مقصود سمجھے جب انسان توحید کے اس مقام عالی پر فائز ہو جاتا ہے تو اُسے ولایت کا درجہ خود بخود مل جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے یہ بیان کر کے فرمایا کہ آپ نے دیکھا کہ حضرت بابو جی نے ولایت کی کس قدر مختصر اور جامع تعریف فرمادی جو آج تک میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھی۔ میں نے مفتی صاحب کی بات کو مزید تقویت دینے کے لیے گزارش کی کہ حضرت دادا صاحب نے ولایت کی جو تعریف فرمائی ہے وہ تو اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا اَرٰبٰنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَغَامُوْا کی تفسیر ہے۔ یہ سن کر مفتی صاحب مزید خوش ہوئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہر حیثیت سے یقین رکھنا اور پھر اس پر استقامت اختیار کئے رہنا ہی ایک بندہ مومن کے کامل الایمان ہونے کی دلیل اتم ہے اور یہی ولایت ہے، مگر ہماری بد قسمتی دیکھئے کہ ہم عوام کے سامنے وہ چیزیں بیان نہیں کرتے، جن کی تعلیم قرآن و سنت اور پھر خود صوفیاء نے دی، بلکہ صرف اُن کے کشف و کرامات کے بیان کو کافی سمجھتے ہیں اور اُن عوامل کا عہد اُذکر نہیں کرتے جن کی بناء پر وہ ان مقامات کے قابل بنے۔ یہی وجہ ہے کہ آج خانقاہوں میں آنے والے سادہ لوح مسلمان عقائد کے لحاظ

سے اس قدر پسماندہ ہیں کہ اگر محفل میں کوئی خارق عادت محیر العقول واقعہ کسی بزرگ ولی کی طرف منسوب کر کے بیان کر دیا جائے تو خوب داد دیتے اور نعرے لگاتے ہیں، لیکن اگر اسی نوعیت کا کوئی واقعہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو مایوسی و خاموشی کی تصویر بن جاتے ہیں گویا آیت قرآنی وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ - ترجمہ: جس وقت یاد کیا جاتا ہے اللہ کیلئے نفرت کرتے ہیں دل اُن لوگوں کے کہ نہیں ایمان لاتے ساتھ آخرت کے اور جس وقت کہ یاد کیے جاتے ہیں وہ لوگ کہ سوائے اس کے ہیں، ناگہاں وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے یہ لوگ شرک جیسے ناقابل علاج مرض میں غیر شعوری طور پر غیر محسوس طریقے سے مبتلا ہوتے ہیں، مگر اس کا بنیادی سبب خوشامدی و اعظین، جاہل خطباء اور خود پرست و خود مگر مادی نشین حضرات ہیں جو احبار و رہبان بن کر غریب عوام کی دولت بھی ہڑپ کر رہے ہیں اور ان بے چاروں کی متاع ایمانی کو بھی لوٹ رہے ہیں۔

تصوف پر اعتراض و انکار کی بات ہو رہی تھی اسی سلسلے میں ایک اہم گزارش بحضور علماء و صوفیاء یہ بھی ہے کہ بلاغت کی تعریف آپ کتب علم معانی میں یقیناً ملاحظہ فرما چکے ہوں گے جس کی رو سے مقتضی الحال کے مطابق کلام کرنے کو بلاغت کہتے ہیں اور فن مناظرہ کی کتب و رسائل میں یہ امر بھی موجود ہے کہ دوران مناظرہ دلیل وہ دی جائے جو مسلمات خصم سے ہو، یعنی فریق مخالف کے نزدیک جو چیز حجت سمجھی جاتی ہو ان دو باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دور حاضر کے علماء و مشائخ کا فریضہ منصبی ہے کہ وہ مخالفین و منکرین تصوف کو ایسے مسکت و مدلل جواب دیں، جن کی پشت پر کتاب و سنت کے ناقابل تردید دلائل بھی ہوں اور جنہیں ایک پڑھا لکھا روشن خیال انسان تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ محض یہ کہہ دینا کہ فلاں بزرگ نے یہ لکھا ہے فلاں صوفی یہ کہہ گیا ہے یا ہم کون ہیں بزرگوں کی کتابوں میں کیڑے نکالنے والے؟ یہ کوئی جواب نہیں۔ یہی وجہ ہے آج کا پڑھا لکھا طبقہ تصوف و اہل تصوف کی باتیں تسلیم کرنے کے بجائے مخالفین کی تحریروں زیادہ ذوق و شوق سے پڑھتا

بھی ہے اور انہیں مانتا بھی ہے۔ ماضی قریب کے ایک مشہور و معروف مصنف غلام احمد پرویز اپنی کتاب ”تصوف کی حقیقت“ میں نبوت اور تصوف کے زیر عنوان رقم طراز ہیں:

”ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ اسلام کی انفرادیت اور افضلیت کا مدار ختم نبوت پر ہے اور تصوف نہایت لطیف انداز سے ختم نبوت کی مہر توڑ دیتا ہے۔ نبوت کا مدار مدعی نبوت کے اس دعویٰ پر تھا کہ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے تصوف کا بھی یہی دعویٰ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ نبی کو عطا ہونے والے علم کا نام وحی ہے اور صوفیاء نے اس علم کا نام کشف والہام رکھ لیا۔ صاحب وحی نے اپنے آپ کو نبی یا رسول کہہ کر پیش کیا، صاحب کشف نے اپنے آپ کو صوفی یا ولی کہہ کر پکارا فرق صرف اصطلاحی الفاظ میں ہے، حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے غلطی یہ کی کہ اُس نے اپنے آپ کو نبی مشہور کر دیا اس لیے اُس کی مخالفت ہوئی، جب تک اُس نے اپنے آپ کو نبی نہیں کہا اُسے صوفی سمجھا جاتا رہا اور نہ صرف یہ کہ کسی نے اُس کی مخالفت نہ کی، بلکہ ہر طرف سے اُس کی تعریف و توصیف ہوتی رہی“

مزید لکھتے ہیں ”اب آگے بڑھیے ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے ختم نبوت کی رو سے جب انبیاء علیہم السلام کا آنا ختم ہو گیا تو ظاہر ہے اس سے معجزہ کا امکان بھی باقی نہ رہا، لیکن تصوف نے اس مہر کو بھی توڑ دیا اور یہ عقیدہ وضع کیا کہ خارق عادات و اوقات اب بھی ظہور میں آسکتے ہیں اور آتے ہیں لیکن انہیں معجزات نہیں بلکہ کرامات کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ کشف و وحی کے ضمن میں ہوا، ویسے ہی معجزات اور کرامات کے سلسلہ میں کیا گیا۔ کرامات و معجزات میں فرق صرف نام کا ہے حقیقت کا نہیں۔ (ملاحظہ ہو تصوف کی حقیقت صفحہ 143)

اسی طرح پرویز صاحب نے اور اُن کے دوسرے ہم خیال لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ صوفیاء کشف و کرامات کے چور و راز سے نبوت و رسالت کی عمارت میں داخل ہوئے۔ اگر وہ نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتے تو مرزا غلام احمد کی طرح اُن کی عالمگیر مخالفت کی جاتی اس لیے انہوں نے کشف و کرامات کے دروازے کو استعمال کرنے میں آسانی سمجھی۔ اوپر بیان کئے جانے والے مضمون

اور عبارت کو معتقدین صوفیاء محض مخالفین کی ہرزہ سرائی ہی کہیں گے مگر صرف مخالفین پر چار لفظ بھیجنے سے اُن کے اعتراضات زائل نہیں ہو جاتے بلکہ مدعیان نسبت کو قرآن و سنت کے حوالے سے مسکت جواب پیش کرنا ہوں گے اور جن جن زاویوں سے مخالفین نے اعتراض کیے ہیں اُن اُن زاویوں سے اُن کے صرف الزامی جواب ہی نہیں، بلکہ تحقیقی جواب لکھنا ہوں گے۔

میں تو بحمد اللہ تعالیٰ مقبولوں اور فقیروں کا نیاز مند ہوں، اس کے باوجود بھی مجھے اُن کا مخالف سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ وہ بھی صرف اس بنا پر کہ میں اکابر اولیاء کے عقائد اور تعلیمات کی تشریح کرتا اور اُن کو اپنانے کی تاکید کرتا ہوں اور اُن کی علمی وجاہت اور دینی خدمات کو اُن کی طرف منسوب کرامات پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کرامت یا کشف کا منکر ہوں۔ البتہ صرف اتنا کہتا ہوں کہ جو صوفیائے سلف کی تعلیمات کو چھوڑ کر محض اُن کی طرف منسوب کشف و کرامات کی داستانوں کو دین کا رکن اعظم اور ایمان کا جزو اہم سمجھتے ہیں وہ میدان میں نکلیں اور صرف تقریری طور پر نہیں بلکہ تحریری طور پر مخالفین کے اعتراضات کا مسکت اور ٹھوس جواب دیں، بالخصوص غلام احمد پرویز کی کتاب ”تصوف کی حقیقت“ کو ذرا غور سے پڑھیں اور پارٹی بازی اور تعصب کی عینک اتار کر اُس کے مندرجات اور دلائل کو ملاحظہ کریں اور پھر اُس کے وارد کردہ اعتراضات کا ٹھوس اور مستند جواب بھی تحریر کریں تو پھر کہا جاسکتا ہے کہ معتقدین صوفیاء محض اندھی عقیدت کے مالک نہیں بلکہ علمی زبان میں دلائل قطعیت کے زور سے مخالفین کو دندان شکن جواب دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم اہل سنت، عشاق اولیاء تو کہلاتے ہیں اور اُن کے خلاف یا اُن کے مسلک کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتے لیکن یہ سارا زور اپنوں کی تذلیل پر صرف کیا جاتا ہے اور جو لوگ اس پورے نظام کو ایک فراڈ، شعبہ بازی اور دکانداری کا نام دیتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں اُن کو مدلل جواب دیتے وقت انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔

میں نے اپنی رباعیات کی کتاب ”رنگ نظام“ میں جو مفہیم بیان کیے وہ میرے نزدیک قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق تھے، مگر یا ر لوگوں نے اُس کے خلاف ایک طوفان برپا کئے

رکھا، مگر میری ایک رباعی کا کوئی مسکت اور مبنی بردلائل جواب نہ دے سکے۔ بعض اوقات میں ایسے سوالات کر دیتا ہوں، جو ہمارے ماحول میں ایک کبرام مچا دیتے ہیں، دراصل اُن سوالات سے میرا مقصد صوفیاء کی تذلیل و تحقیر ہرگز نہیں ہوتا، بلکہ مخالفین صوفیاء اور معاندین تصوف کی طرف سے وارد ہو سکے والے اعتراضات کا خدشہ ہوتا ہے، مگر میرے بعض کرم فرما! سے میرا ذاتی نقطہ نظر اور مسلک قرار دیتے ہوئے مجھ پر بے راہ روی کا فتویٰ داغ دیتے ہیں۔ بحمد اللہ میرا دل مطمئن ہے اور میں دین فروش ملاؤں اور نام نہاد مولویوں کے فتوؤں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ صرف دکھ یہ ہوتا ہے کہ آج ہمارے اسلاف کو جن زہریلے تیر ہائے تنقید کا ہدف بنایا جا رہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا صوفیائے سلف ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ اس سارے کیے کرائے کے ذمہ دار اور جوابدہ ہم اُن کے نام نہاد عقیدت مند ہیں، جو اُن کی مخالفت پر قیامت تو پھا کر دیا کرتے ہیں مگر مخالفین کو کوئی دندان شکن اور مدلل جواب دے سکے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ غلام احمد پرویز کے تمام مندرجات سے میں قطعاً متفق نہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اُس کے اٹھائے ہوئے اکثر ایسے سوالات میری نظر میں ہیں، جن کا قرآن و سنت کے حوالے سے مدلل جواب وقت کی اہم ضرورت اور بزرگان دین سے تعلق و عقیدت کا عین تقاضا ہے۔ لہذا میں اولیائے کرام کی تعلیمات و خدمات کے بجائے صرف اُن کے کرامات کو اہمیت دینے اور ذکر کرنے والے خطباء و مشائخ اور علماء سے گزارش کروں گا کہ خدا را وہ اپنے بہت ہی قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر کم از کم پرویز صاحب کی کتاب ”تصوف کی حقیقت“ ہی کا قرآن و سنت کی روشنی میں مدلل جواب کتابی صورت میں اُمت کے سامنے پیش کریں، کیونکہ اس کتاب میں تمام سلاسل کے صوفیاء کے کرامات کشف وغیرہ کا خوب آپریشن کیا گیا ہے۔ آج تمام سلاسل کے مشائخ کا یہ فرض منہی بنتا ہے کہ وہ اپنے باکمال اسلاف کے نام پر ملنے والی عزتوں اور نذر و نیاز پر ہی اکتفا نہ کریں، بلکہ اپنے مخالفین کو یہ بات قرآن و سنت کے ناقابل تردید دلائل و براہین سے ثابت کر کے بتائیں کہ تصوف محض نبوت کی مہارت میں بذریعہ کشف و کرامات نقب زنی کر کے داخل ہونے کا نام نہیں، بلکہ قرآن و سنت کے مستند حوالوں سے

اس کی حقیقت یوں نہیں، یوں ہے۔ قرآن کریم اور اکابر صوفیاء کی تعلیمات کی روشنی میں مسائل و معاملات کو زیر بحث لانا کوئی گناہ نہیں۔ میں نے بھی تو سب کی طرح یہی کچھ کیا اور کرتا ہوں، پھر آخر صرف مجھی پر اعتراض کیوں؟ بقول شاعر۔

یہی کہا تھا، مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر ناپید

☆☆☆☆☆☆



تصانیف نصیر

- 1:- لفظ اللہ کی تحقیق (متلاشیانِ راہ حق کے لیے سامانِ تحقیق) مطبوعہ
- 2:- قرآن مجید کے آداب تلاوت (قرآن مجید کی رفعت و عظمت، قلوب و اذان میں جاگزیں کرنے والا رسالہ) مطبوعہ
- 3:- موازنہ علم و کرامت (مقامِ علم لکھانے والوں کے لیے تازیانہِ عبرت) مطبوعہ
- 4:- اعانت و استعانت کی شرعی حیثیت (اثباتِ توحید و ردِ شرک کے لیے دلائل قاطعہ) مطبوعہ
- 5:- نام و نسب (سیادتِ نوٹ پاک کے تحقیقی ثبوت، نکاحِ سیدہ کی شرعی حیثیت اور شیعہ و خوارج کے عقائد کا تفصیلی جائزہ) مطبوعہ
- 6:- حضرت پیرانِ پورؒ کی شخصیت، سیرت اور تعلیمات (ایک ایمان افروز اور شرک سوز مقالہ) مطبوعہ
- 7:- راہِ رسم منزلِ ہا (تہذیب اور عصری مسائل پر سیر حاصل بحث) مطبوعہ
- 8:- امام ابوحنیفہؒ اور ان کا طرزِ استدلال (امامِ ائمہؒ سراجِ اللامۃؒ کے علمی و فقہی مقام و مرتبہ کا بیان) مطبوعہ
- 9:- کیا اہلسنی عالم تھا؟ (اربابِ علم و اصحابِ تحقیق کے لیے پیغامِ مہابات) مطبوعہ
- 10:- اسلام میں شاعری کی حیثیت (ایک انوکھا اور اچھوتا تحقیقی مقالہ) مطبوعہ
- 11:- رنگِ نظام (قرآن وحدیث کی روشنی میں اردو مجموعہ رباعیات) مطبوعہ
- 12:- دیں ہمدِ اوست (عربی فارسی اردو اور پنجابی لغتیں) مطبوعہ
- 13:- فیضِ نسبت (عربی فارسی اردو اور پنجابی میں مناقب) مطبوعہ
- 14:- آنغوشِ حیرت (فارسی رباعیات) مطبوعہ
- 15:- چالِ شب (اردو غزلیات کا پہلا مجموعہ) مطبوعہ
- 16:- دستِ نظر (اردو غزلیات کا دوسرا مجموعہ) مطبوعہ
- 17:- عرشِ ناز (فارسی اردو پوری پنجابی اور سرائیکی میں متفرق کلام) مطبوعہ
- 18:- لطمۃ الغیب علی ازالۃ الزیغ (حضرت پیرانِ پورؒ کے گستاخوں کے منہ پر ٹہنی طمانچہ) مطبوعہ